دوڑو جنت کی طرف

آل عمران: آیات ۱۳۳ تا ۱۳۶ کا درس

خُرّم مُرادؔ

منشورات

00145 / 10

جملہ حقوق محفوظ

دوڑو جنت کی طرف! از خرم مرادؒ

نومبر ۲۰۰۸ء_ تعداد: ۲۰۰۰_ کوڈ: 00145_ قیمت: ۱۰ روپے

ناشر: **منشورات**، منصورہ، لاہور۔ ۵۴۷۹۰_ مطبع: جے کیو پریس، بندر روڈ، لاہور۔

فون: 35252211_ فیکس: 042-35252210_ ای میل: manshurat@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ۙ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ۚ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ قف وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَافَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝

(اٰل عمرٰن ۳:۱۳۳۔۱۳۶)

دوڑ کر چلو اُس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اُس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، اور وہ اُن خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، خواہ بدحال ہوں یا خوشحال، جو غصّے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔ اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو؟ اور وہ کبھی دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ اُن کو معاف کر دے گا اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی

ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک اعمال کرنے والوں کے لیے۔

قرآن مجید کا یہ حصّہ بہت اہمیّت کا حامل ہے اور دین کی بنیادی تعلیمات کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہ ہمارے سامنے اس بات کو کھول کر رکھتا ہے کہ زندگی میں مطلوب و مقصود کیا ہے؟ وہ منزل وہ ہدف کیا ہے جس کے لیے تگ و دو، بھاگ دوڑ اور محنت ہونی چاہیے، اور کس طرح کی محنت اور بھاگ دوڑ مطلوب ہے، نیز وہ کون سی شرائط ہیں جن کے نتیجے کے طور پر ہماری بھاگ دوڑ اور محنت کی مزدوری یقینی ہو جاتی ہے؟ گویا یہ تین بنیادی سوالات ہیں جن کے جوابات ان آیات میں دیے گئے ہیں۔

پہلی بات یہ کہ ہمارے لیے مطلوب و مقصودِ اصلی کیا ہے؟

دوسرا یہ کہ اس مطلوب و مقصود کو حاصل کرنے کی کیفیت کیا ہونی چاہیے؟

تیسرا یہ کہ اس کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے، کیا بننا چاہیے، اور کیسی محنت کرنی چاہیے جس سے وہ مطلوب و مقصود حاصل ہو جائے؟

اللہ تعالیٰ کا انعام

دُنیا میں جب ہم منظّم انداز میں ایک جماعت بنا کر دین کی سربلندی کے لیے اجتماعی جدوجہد کرتے ہیں تو دُنیا کی حد تک ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اللہ کا دین نافذ اور قائم ہو، اس کی حکومت اُس کی زمین پر قائم ہو، اس کے بندے اُس کی بندگی کے ماتحت آ جائیں، اور اگر ان میں سے کوئی کام بھی نہ ہو، اگرچہ مشیت اور حالات ان میں سے کسی کام کو بھی مکمل ہونے کی اجازت نہ دیں، تب بھی آخری دم تک ہم اپنی ساری قوتیں نچوڑ کر، اپنا وقت، صلاحیتیں اور وسائل جس قدر بھی ممکن ہو، اسی جدوجہد میں لگا دیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے کہ دُنیا میں اقامت دین کی منزل آئے، ہم جدوجہد کرتے ہوئے اس دُنیا سے رخصت ہو جائیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ کی مشیت اور حالات کے تحت وہ منزل بہت دور ہواور جدوجہد طویل ہوجائے۔لیکن ہم میں سے ہرایک کے لیےاس کے باوجود اپنی محنت، اپنےعمل اور اپنی بھاگ دوڑ اور جدوجہد کا ایک ہی ہدف اور مطلوب ہے، اور وہ اس آیت کے اندر واضح کیا گیا ہے: دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اوراس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین اورآسمان کے برابر ہے یا زمین اورآسمان پر حاوی ہے، یا کہیں یہ ترجمہ کیا گیا ہے کہ جس کا عرض زمین وآسمان ہے۔

یہاں یہ بات اللہ نے ایک دعوت کے انداز میں فرمائی ہے۔یہی دراصل وہ مطلوب ہے، وہ جنت کہ جس کا وعدہ اللہ نے اپنے اُن بندوں سے کیا ہے جو اسی کی بندگی اختیار کریں، اوراُس کی بندگی کی راہ میں اپنی پوری زندگی لگادیں،اوردین کوقائم کرنے کے لیےجدوجہد کریں۔

یہ بات قرآن مجید سےاور نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کومختلف اوقات میں جو ہدایات دیں یا اُن کو جو نصیحتیں کیں، ان سے بالکل واضح طور پر سامنےآتی ہے کہ بحیثیتِ فرد یہی وہ مطلوب ہے جس کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔مطلوبِ اصلی تو اللہ تعالیٰ کی رضا اورخوشنودی ہے،لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا آخرت میں جنت کی شکل میں ان بندوں کے لیے تیار کی گئی ہے، جواس کی راہ پر چلیں، اُس کی بندگی کریں اوراس کی راہ میں جدوجہد کریں۔

بیعتِ عقبہ کا مشہور واقعہ ہے جس میں مدینہ سے ۷۲ افراد شریک ہوئے تھے اورانھوں نے نبی ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اورآپ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی تھی۔ جب گفتگو مکمل ہوگئی تو انصار میں سے ایک صاحب کھڑے ہوگئے اورانھوں نے کہا کہ تمھیں معلوم ہے کہ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ اس کے نتیجے میں تمھارے مرد قتل ہوں گے، تمھاری عورتیں بیوہ ہوں گی اور لونڈیاں بنائی جائیں گی، تمھارے اموال لٹیں گے، بچے یتیم ہوں گے —— کیاتم سب اس کے لیے تیار ہو؟ اس پرانصار نے بہ یک زبان کہا کہ ہاں ہم ہرقربانی کے لیے تیار ہیں۔گویا اس بیعت کے نتیجے میں انصار اپنا سب کچھ اللہ کے لیے، اللہ کی راہ میں جہاد،

نبی ﷺ کے ساتھ اپنے عہد کو وفا کرنے، اور نبی ﷺ کے ساتھ چلنے میں قربان کر دینے کا باقاعدہ عہد کر چکے تھے۔

اس موقع پر نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ اگر ہم یہ سب کچھ کر گزریں تو اس کے بدلے میں ہمیں کیا ملے گا؟ آپ ﷺ کا جواب صرف ایک لفظ تھا: جنت۔ گویا اگر تم یہ سب کچھ کر گزرو گے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ تم کو جنت کے انعام سے سرفراز فرمائے گا۔ اسی کی طلب اور جستجو تھی اور اسی کی چاہت اور خواہش تھی جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دل میں رچ بس گئی تھی۔ اگر اس کا کچھ حصّہ بھی ہمارے دلوں میں پیدا ہو جائے، تو ہم بھی صحیح معنوں میں دین کے لیے جدوجہد کر سکیں گے اور اللہ تعالیٰ کے انعام کے مستحق ٹھیریں گے۔

جنت ان کے لیے کوئی ایسی چیز نہیں رہی تھی کہ جس کا ذکر وہ کتابوں میں پڑھیں، وعظ میں سنیں یا پھر قرآن میں پڑھ کر گزر جائیں، بلکہ آخرت اور آخرت میں جنت کا انعام ان کے لیے زندہ حقیقت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر چہ انھوں نے اس کو آنکھوں سے نہ دیکھا تھا اور ہم نے بھی نہیں دیکھا ہے، اور مطالبہ ایمان بالغیب کا ہے، لیکن جب تک یہ جنت ہمارے لیے آنکھوں دیکھی حقیقت، آنکھوں دیکھی لذت، چاہت اور نعمت جیسی حیثیت اختیار نہیں کرے گی، اس وقت تک ہم اللہ تعالیٰ کی بندگی کے تقاضے صحیح طرح پورے نہ کر سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں فرمایا کہ وہ نبی جو تم کو خود اللہ کی بندگی کی دعوت دے رہا ہے، اور اس کے نتیجے میں جنت کی بشارت دے رہا ہے، اور انکار کی صورت میں جہنّم کی وعید سنا رہا ہے، یہ نبی ﷺ خود جنت الماویٰ سے ہو کر آیا ہے، اس کو دیکھ کر آیا ہے۔ یہ واقعہ بھی سیرت اور حدیث کی کتابوں میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے طویل وعظ فرمایا اور پھر منبر سے کھڑے کھڑے ہاتھ بڑھایا اور پھر پیچھے ہٹا لیا۔ بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے سوال کیا یہ آپ ﷺ نے کیا کیا تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنت کے خوشے میری نگاہوں کے سامنے تھے اور میں نے چاہا کہ توڑ

کر تمھیں دکھادوں لیکن اس دُنیا کے اندر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔

یہ جنت جب ان کے لیے حقیقت بن گئی، تو اس کی خاطر وہ دنیا کی ہر چیز قربان کرنے کے لیے خوشی خوشی تیار ہو جاتے تھے۔ یہ ان کے لیے کتابوں میں پڑھی جانے والی چیز نہ تھی، بلکہ اُن کو اس کی خوشبو پہاڑوں کے پیچھے سے آتی تھی۔ جنت کے باغات اُن کی نگاہ میں اس طرح رہتے تھے کہ ان کی خاطر وہ اپنی دُنیا کے قیمتی باغات بے دریغ اٹھا کر دے دیتے تھے۔ یہ وہ کیفیت تھی جو جنت کو مطلوب اور مقصود بنانے سے پیدا ہوئی تھی۔

اہل جنت کا طرزِ عمل

یہ بات بھی واضح اور ایک حقیقت ہے کہ آدمی جس چیز کی طلب کرتا ہے، اسی کے رنگ میں رنگتا چلا جاتا ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے اور اس بات کو جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی شخص دُنیا طلب کرے گا تو دُنیا کی طلب اس کو جو کچھ مادی نعمتیں دے گی وہ اپنی جگہ پر، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا سوچنے کا انداز، زندگی بسر کرنے کا طریقہ، اس کی فکر، اس کا کردار، سب کچھ دُنیا طلبی کے ایک مخصوص سانچے میں ڈھلتا چلا جائے گا۔ جو چیز سامنے ہے اور جلدی ملنے والی ہے اس کو وہ اختیار کرے گا۔ اس کے اندر بے صبری ہوگی اور دُنیا کے لیے وہ مضطرب اور بے چین رہے گا۔ دُنیا کے قلیل مفادات کے لیے اس کی سوچ محدود رہے گی۔ اگر دُنیا آنکھیں پھیرے گی تو وہ مایوس ہو جائے گا، اور اگر دُنیا اپنا ہاتھ کھول دے گی تو وہ اس کی طرف لپکے گا۔ یہ ساری کیفیات اس لیے پیدا ہوں گی کہ اس نے دُنیا کو اپنا مطلوب و مقصود بنایا ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر یہ بات بھی صحیح ہے کہ جو جنت کو اپنا مطلوب و مقصود بنائے گا، اُسے وہاں پر جو کچھ ملے گا وہ تو اس کے لیے مخصوص ہے ہی لیکن یہاں پر اس کی زندگی بسر کرنے کا انداز، اس کی سوچ، زندگی میں اس کے مقاصد اور اس کا پورا طرز زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھل جائے گا، جو واقعی اس کو اس بات کا مستحق بنائے گا کہ وہ جنت میں داخل ہو۔ اس لیے کہ جنت،

ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ ہے۔ گویا یہاں بھی اس کا طرزِعمل اور زندگی اُس سانچے میں ڈھل جائے گی جو اصحاب الجنہ کی ہوگی۔ وہ ان سے بالکل مختلف ہوں گے جو دُنیا کے طلب گار یا اصحاب النار ہوں گے۔

لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ o (الحشر ۵۹:۲۰)

دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں۔

گویا اہل جنت اور اہل دوزخ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ آخرت میں ہر آدمی جان لے گا کہ دونوں آج برابر نہیں ہیں۔ جنت میں جانے والے جنت میں جا رہے ہوں گے اور دوزخ میں جانے والے دوزخ میں۔ آج بھی جو لوگ جنت کے طلب گار ہوں، ان کا سوچنے کا انداز، ان کا طرزِ زندگی اور طرزِعمل، ہر حوالے سے ان کا کردار ان سے بالکل مختلف ہونا ضروری ہے جو جنت کو طلب کرنے والے نہ ہوں۔ یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو تصویر کھینچی ہے، اُس کو سامنے رکھ کر اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اہل جنت کا طرزِعمل اور کردار کیسا ہونا چاہیے۔

جنت کے دو راستے: ایمان اور عمل

جنت میں آدمی ہمیشہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کی ہر نعمت کے لیے خلود اور دوام کا وعدہ کیا ہے۔ اس کے سائے بھی ہمیشہ کے لیے ہیں۔ اُکُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا ؕ [الرعد ۱۳:۳۵] اس کے پھل اور اس کے سائے دائمی اور ہمیشہ رہنے والے ہیں، یہ سدابہار، ہری بھری اور سرسبز رہنے والی جگہ ہے۔ اس کے لیے پانی کی نہریں بہا دی گئی ہیں تاکہ خشک سالی کا کوئی خدشہ نہ ہو۔ یہ خلود دراصل دُنیا کی عارضی حیثیت سے بالکل متضاد ہے۔ دُنیا میں ہر چیز چھن جانے اور ختم

ہوجانے والی ہے کہ آخرت میں ہر چیز جو کہ دُنیا کی نعمتیں ہی ہیں، ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں۔ اس کے معانی یہ ہوئے جب کہ اگر جنت ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ ہے، تو کم سے کم آخری سانس آنے تک اس ایمان کو اسی طرح سرسبز وشاداب اور پُر بہار رہنا چاہیے جس طرح کہ جنت سرسبز وشاداب اور سدا بہار ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آج مایوسی کی آندھی چلی اور اولے پڑے تو ایمان سرد پڑ گیا اور غائب ہوگیا۔

یہ نہ ہو کہ آج مشکلات اور رکاوٹیں آئیں اور ایمان کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ لوگوں نے راستہ روکا اور عمل صالح کے راستے سے ہٹ گئے۔ اس راہ میں لغزشیں اور خطائیں بھی ہوں گی، اُن کا ذکر آگے آئے گا۔ البتہ جو آدمی جنت کا طلب گار ہو وہ اسی طرح آخری سانس تک اپنے ایمان کو تازہ رکھے گا اور اس کا ایمان تروتازہ رہے گا۔ اس لیے کہ جس نے دُنیا کو مقصود بنایا ہو، بلکہ جس نے مقصودِ زندگی اسلامی ریاست کو بھی بنایا ہو وہ بھی کسی مرحلے پر تھک ہار کر بیٹھ جائے گا، لیکن جس نے مقصود اللہ کی رضا اور جنت کو بنایا ہو، اس کا ایمان آخری سانس تک تروتازہ رہے گا۔ اگر یہاں اس کا ایمان تروتازہ رہے گا تو وہ وہاں اس جنت کا مستحق ہوگا جو ہمیشہ رہنے کی جگہ ہے، اور سرسبز وشاداب ہے۔ یہاں کی زندگی کے چند برسوں میں مسلسل ایمان پر جمے رہنے کے نتیجے میں آخرت میں لامتناہی، قرن ہا قرن تک ایک سرسبز وشاداب انعام محفوظ ہے۔

عمل صالح ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں قرآن میں بار بار آیا ہے، احادیث میں بہت ساری تمثیلات ہیں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ عمل صالح ہی ہے جس کے نتیجے میں جنت ظہور پذیر ہوگی۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ذکر اور تسبیحات جنت کے میوے ہیں۔ اسی طرح بہت ساری برائیوں اور بھلائیوں کی تمثیل آپ ﷺ نے بیان فرمائی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ جنت حقیقت نہیں ہے، اور یہ صرف ایک وعدہ اور مثال ہے بلکہ یہ کہہ

رہا ہوں کہ یہاں کے عمل صالح کا ظہور آخرت میں جنت کی شکل میں ہوگا۔ بعض علما نے کہا ہے کہ جنت میں نہروں اور درختوں کا ذکر آیا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بھی ایمان کی مثال قرآن میں درخت ہی سے دی ہے:

كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ (ابراهیم ۱۴:۲۴)

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔

چنانچہ وہاں پر جب درختوں کا ذکر کیا گیا ہے تو یہ دراصل ایمان کا ثمر ہے کیونکہ یہاں پر ایمان کی آبیاری عمل صالح سے ہوتی ہے۔ اسی طرح وہاں پر جن نہروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ دراصل عمل صالح کی تشبیہ ہے۔ یہاں پر دراصل عمل صالح سے ایمان کے درخت کی آبیاری ہوتی ہے، وہ پروان چڑھتا ہے اوراس میں پھل پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح جنت کے اندر بھی نہریں ہوں گی۔ مقصود یہ ہے کہ جو یہاں پر ایمان اور عمل صالح، دونوں کے لیے فکر مند رہے گا اور بغیر تھکے ہارے، بغیر مایوس ہوئے اور بغیر لغزش کھائے، اسی راہ پر گامزن رہے گا تو وہ اصحاب الجنۃ کی راہ پر ہوگا۔ اس دُنیا میں بھی جنت کے طلب گار کی زندگی اور کردار میں نمایاں اور واضح فرق ہوگا۔

اسی طرح یہ فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ جنت میں ہوں گے وہ آپس میں بھائی بھائی ہوں گے۔ جب وہ آمنے سامنے بیٹھیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کا میل دور کردے گا۔ لہٰذا یہاں پر جو لوگ جنت کے طلب گار ہوں اگر اُن کے اندر اخوت ومحبت کی وہی فضا اور دلوں کی صفائی اور پاکیزگی کا وہی معیار بڑی حد تک موجود ہوگا تو جنت میں اسی طریقے سے ظہور پذیر ہوگا۔ پھر جنت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جنت تو وہ ہے جس کی وسعت میں زمین اور آسمان سما جائیں۔ جنت کی نعمتوں کے بارے میں قرآن نے کہا ہے کہ یہ وہ نعمتیں ہیں جن کا آدمی

تصور نہیں کر سکتا۔ حدیث میں بھی آیا ہے کہ وہ نعمتیں ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہیں اور نہ کسی کان نے سنی ہیں اور نہ انسان ان کو تصور میں لا سکتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ جنت تو وہ ہے کہ جس میں زمین اور آسمان سما جائیں۔

دُنیا میں جو جنت کا طلب گار ہوتا ہے، اس کی نگاہ ایسے مقاصد اور اہداف پر ہوتی ہے جو بڑے بلند اور اونچے ہوں۔ وہ چند ٹکوں، دُنیا کے عارضی فائدوں، خوشامد اور جھوٹی تعریف یا دُنیا کے ان رُتبوں کا جو چھن جانے والے ہیں، طلب گار نہیں ہوتا اور نہ ان کے لیے وسائل اور صلاحیتیں لگاتا ہے، بلکہ اس کی نگاہ اس جنت پر جا کر ٹھیرتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمان کے برابر ہے۔ لہٰذا یہاں پر بھی اُس کی نگاہ اُن چیزوں پر ٹھیرنی چاہیے، جو ارفع و اعلیٰ اور بلند ہوں نہ کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو وہ اپنا مقصود بنائے۔ اللہ تعالیٰ نے مقصود ہمارے سامنے رکھ دیا ہے اور یہ مقصود محض وعظ و نصیحت یا وعدے کے لیے نہیں ہے، بلکہ فی الواقع زندگی بسر کرتے ہوئے اگر یہ ہمارے سامنے رہے تو اس کے بڑے گہرے اثرات سوچ، فکر و عمل اور کردار پر پڑتے ہیں۔

جنت کی دوڑ

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ (اٰل عمرٰن ۳:۱۳۳)

دوڑ کر چلو اُس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اُس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے۔

یہاں پر دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے: ایک مغفرت اور دوسری جنت کا۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اس کی طلب کی کیفیت کو ایک لفظ کے ذریعے بیان کیا ہے اور وہ لفظ ہے سَارِعُوْا [تیزی کے ساتھ]۔ ذرا تھوڑی دیر کے لیے تیزی کے ساتھ دوڑنے

والے فرد کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچیں۔ درحقیقت جو آدمی تیزی کے ساتھ دوڑ رہا ہو اس کی ایک خاص کیفیت ہوتی ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے دو باتیں ہمارے سامنے رکھی ہیں اور ان کے حصول کے لیے محنت کی ضرورت ہے۔ یہ صرف خواہشات اور دُعاؤں سے حاصل نہیں ہوں گی۔ خواہشات اور دُعائیں بھی اپنی جگہ ضروری ہیں، لیکن اس کے لیے بھاگ دوڑ اور سخت محنت کی ضرورت ہے۔ یہ دراصل محنت اور بھاگ دوڑ کا نتیجہ ہی ہے جو سامنے آنے والا ہے۔ آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے یا ایسے وسائل یا کسی ایسے شارٹ کٹ کی تلاش میں رہے کہ بغیر کچھ کیے جنت میں پہنچ جائے تو یہ خام خیالی اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی لفظ تیزی کے ساتھ بھاگنے والے آدمی کا ذکر کر کے دور کر دی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ بھاگ دوڑ کی بات ہے۔

بھاگنے والا آدمی ایک نکتے پر اپنی نگاہیں مرکوز رکھتا ہے۔ وہ ایسا نہیں کرتا کہ کبھی اِدھر دیکھے اور کبھی اُدھر۔ چہل قدمی کرنے والا آدمی تو ایسا کر سکتا ہے کہ وہ دائیں بائیں دیکھتا ہوا آرام سے چلتا ہے، لیکن بھاگنے والے کی نگاہیں اپنے مرکز کے اوپر جمی رہتی ہیں۔ اس کی نگاہیں دُنیا کی تلاش میں یا کسی اور دل چسپی کی وجہ سے بہکتی نہیں ہیں یا ہٹتی نہیں ہیں اور نہ خیانت کرتی ہیں بلکہ اپنی منزل پر مرکوز رہتی ہیں۔ پھر بھاگنے والا آدمی یوں بھی نہیں کرتا کہ مست ہو جائے یا دائیں بائیں نکل جائے بلکہ وہ تو سیدھا دوڑتا ہے۔ شارٹ کٹ یہ نہیں ہوتا کہ بغیر کچھ کیے کہیں پہنچا جائے، بلکہ اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے کوئی مختصر راستہ اپنایا جائے۔ وہ ادھر اُدھر اپنا وقت ضائع نہیں کرتا بلکہ کوشش کرتا ہے کہ سیدھا اپنی منزل پر پہنچے۔

سارعوا میں اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے کہ دیکھو اگر یہ جنت تمھیں ملے گی، تو تگ و دو، بھاگ دوڑ اور محنت کے نتیجے کے طور پر ملے گی، اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ اس کے لیے جو محنت درکار ہے اس کی کیفیت ایسی ہے کہ جس طرح آدمی اپنے مطلوب کی طرف، ہدف [Goal] کی طرف تیزی سے بھاگتا اور دوڑتا ہے، اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی

کوشش کرتا ہے۔ آدمی جس طرح دُنیا میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے پر تفاخر اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتا ہے کہ میرا مکان اس سے بڑھ کر ہو، میرا لباس اس سے بہتر ہو، میرے پاس مال اس سے زیادہ ہو، اور میرا مقام و رتبہ اس سے بڑھ کر ہو، اسی طرح جنت کے طلب گار کی بھی کوشش ہوگی کہ وہ ہر میدان میں دوسروں سے بڑھ کر اس طرح کے کام کرے کہ اس کے نتیجے میں اسے جنت حاصل ہو جائے۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ یہی وہ چیز ہے جس کے حصول کے لیے محنت کرنا سزاوار اور مستحب ہے:

سورۂ صٓ میں اللہ تعالیٰ نے جنت کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے محنت کرنے والوں کو محنت کرنا چاہیے۔ اگر کوئی دُنیا میں محنت کرنا چاہتا ہے تو جنت ہی وہ چیز ہے جس کے لیے محنت کرنا چاہیے۔

اِنَّ ھٰذَا لَھُوَا لْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ° لِمِثْلِ ھٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ° (الصّٰفّٰت ۳۷:۶۰۔۶۱)

یقیناً یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔ ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔

سورۃ المطففین میں فرمایا:

وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَا فَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ° (المطففین ۸۳:۲۶)

اور جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔

گویا جو لوگ اپنے آپ کو جھونک دینے والے ہیں، محنت کرنے والے ہیں، خواہش کرنے والے ہیں، تو جنت ہی وہ چیز ہے جس کے لیے اپنے آپ کو جھونک دُنیا چاہیے، خواہش کرنی چاہیے،

ایک دوسرے پر رشک کرنا چاہیے، اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہاں جنت کی طلب کے ساتھ ساتھ مغفرت کا ذکر بھی آیا ہے۔ مغفرت کے معنی دراصل یہ ہیں کہ محنت اور بھاگ دوڑ اگرچہ ضروری ہے، لیکن جنت میں داخلے کے لیے اس غفور و رحیم رب کی دست گیری بھی ضروری ہے جو جنت میں داخل کرنے والا ہے۔ آخرت کے امتحان کے بارے میں لوگوں نے دو انتہا پسندانہ رویے اختیار کیے ہیں۔ ایک رویہ یہ ہے کہ یہ ناپ تول کے انداز میں صرف انسان کے عمل کا نتیجہ ہے اور اس میں کسی دوسری چیز کا کوئی دخل نہیں ہے۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عمل ہو نہ ہو، کسی کی نگاہ پڑ جائے یا کوئی معمولی سا نیک کام ہو جائے تو جنت حاصل ہو جائے گی۔ اس کے برعکس قرآن مجید ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جنت کے حصول کے لیے محنت، بھاگ دوڑ، لگن، توجہ اور یک سوئی کے ساتھ لازماً جدوجہد کرنی پڑے گی، لیکن صرف محنت کا سہارا کافی نہیں ہے بلکہ نگاہ اللہ کی مغفرت پر ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ دُنیا کی زندگی ایک امتحان ہے، اور ایسا امتحان ہے جس میں اس بات کی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ جو آدمی یک سو ہو کر بھی امتحان میں کامیاب ہونا چاہے گا اس کے قدم لغزش نہیں کھائیں گے، وہ خطا کار نہ ہوگا اور اس سے غلطیاں و کوتاہیاں سرزد نہیں ہوں گی۔ ایک حدیث کے الفاظ میں کہ جب آدمی پانی پر چلتا ہے تو اس کے پاؤں لازماً بھیگتے ہیں۔ اسی طرح جو آدمی دُنیا میں زندگی بسر کرے گا، گناہوں سے ضرور آلودہ ہوگا۔

انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے، خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا o[النسآء۴:۲۸]، اس کی فطرت میں عجلت پسندی رکھ دی گئی ہے اور جو چیز جلد ملنے والی ہو اس کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ انسان جس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے، جو اپنے ارادے کا کمزور ہے، لازمی بات ہے کہ اس سے لغزشیں اور خطائیں بھی سرزد ہوں گی۔ بات یہی نہیں ہے کہ نگاہ خدا کی مغفرت پر ہو بلکہ پوری زندگی کا مقصود ہی اللہ کے ساتھ تعلّق ہونا چاہیے۔ جو آدمی اپنے ہی عمل پر انحصار کر کے بیٹھ جائے،

اس کا اپنے رب کے ساتھ تعلّق کٹ جائے گا۔لیکن جو یہ سمجھے کہ مجھے جنت میں داخلے کے لیے محنت تو کرنی ہے،لیکن اس کے ساتھ اللہ کی رحمت اور دست گیری اور شفقت ضروری ہے،اسی کا اللہ تعالیٰ سے حقیقی معنوں میں تعلّق قائم ہوتا ہے۔اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور بخشش کی طرف دوڑو،اور جنت کی طرف بھی جس کی وسعت میں زمین وآسمان سما جائیں۔

اہل جنت کی صفات

اس کے بعد ان صفات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو اہل جنت کی صفات ہیں،نیز یہ کہ جنت کن لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے،اور وہ کن صفات و اوصاف کے حامل ہوں گے۔قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَo (اٰل عمرٰن ۳:۱۳۳)
اور وہ اُن خدا ترس لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

یہ بات قرآن مجید میں کئی مقامات پر کہی گئی ہے:وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ غَیْرَ بَعِیْدٍo (قٓ ۵۰:۳۱)اور جنت متقین کے قریب لے آئی جائے گی،کچھ بھی دور نہ ہوگی۔ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِیًّا o(مریم ۱۹:۶۳)یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اُس کو بنائیں گے جو پرہیزگار رہا ہے۔

قرآن مجید میں تقویٰ کی صفت کی بہت ساری وضاحتیں بڑے خوب صورت پیرائے میں بیان کی گئی ہیں۔بنیادی طور پر یہ بات سمجھنے کی ہے کہ تقویٰ جہاں عمل کی ایک صورت کا نام ہے، وہاں دراصل یہ دل کی کیفیت اور انسان کی شخصیت کی قابلیت اور استعداد کا نام بھی ہے۔ تقویٰ کے معنی ہیں بچنا اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کو نقصان پہنچانے والی ہوتی ہے، اس سے وہ بچتا ہے،اور جو فائدہ پہنچانے والی ہوتی ہے،اس کو وہ طلب کرتا ہے۔منفی بات یوں

کہی گئی ہے، کہ مثبت بات کا پہلے ذکر آ گیا ہے کہ جنت کی طلب ہونی چاہیے اور اللہ کی رضا کی تلاش ہونی چاہیے۔ یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ جو آدمی نقصان سے بچے گا وہ لازمی فائدے کی طلب میں جائے گا اور نفع کی طلب کرنے والے کے لیے خطرہ ہے کہ نقصان میں پڑ جائے، اور جو اپنے آپ کو نقصان سے بچائے گا وہ لازماً نفع میں جائے گا۔ اس لیے تقویٰ بظاہر ایک منفی بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کا ڈر اور خوف اور ان چیزوں سے بچنا جو اس کو ناراض کرنے والی ہیں لیکن اس کے اندر مثبت پہلو یہ ہے کہ ان چیزوں کو تلاش کرنا جو اس کو خوش کرنے والی ہیں۔

تقویٰ دل کی ایک کیفیت کا نام بھی ہے۔ اس کی وضاحت ایک حدیث میں یوں بیان فرمائی گئی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا: تقویٰ یہاں ہے۔ تین مرتبہ آپ ﷺ نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہے۔

قرآن مجید نے بھی ایمان اور عمل صالح، اللہ کی محبت اور بہت ساری چیزوں کو تقویٰ کی صفت کے اندر شامل کیا ہے۔ تقویٰ کو ایک مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ اس وقت ممکن ہے، جب دُنیا میں یہ یقین ہو جائے کہ جس طرح دُنیا کی آگ کے قریب جاؤ تو وہ جلا ڈالتی ہے، اسی طرح اگر میں جہنّم کی آگ کے قریب جاؤں گا تو وہ بھی مجھے جلا ڈالے گی۔ اس کیفیت کے انسان جتنا قریب ہوگا، اتنی ہی تقویٰ کی صفت اس کے اندر پیدا ہوگی۔

تقویٰ کی کیفیت کا ایک مظہر یہ ہے کہ جب انسان کا ہاتھ آگ کی طرف جاتا ہے تو خود بخود پیچھے کھنچ آتا ہے۔ اس لیے کہ آپ کا دل اس کیفیت اور یقین کے ساتھ بھرا ہوا ہے کہ آگ جلانے والی ہے لہٰذا گرمی محسوس کرتے ہی ہاتھ پیچھے کھنچ آئے گا۔ ممکن ہے کہ بچہ غلطی کے ساتھ ہاتھ آگ میں ڈال دے، اس لیے کہ ابھی اس کے ذہن میں اس کے نقصان کا پوری طرح یقین نہیں ہے۔ وہ بجلی کے کرنٹ کو بھی ہاتھ لگا دے گا، قریب بھی چلا جائے گا اور بعض اوقات

تو بچے جل بھی جاتے ہیں۔لیکن بڑا آدمی یہ نہیں کرسکتا۔اس لیے کہ اس کے دل میں یقین کی کیفیت پیدا ہوچکی ہے۔اس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے آخرت کے مناظر بیان کرکے جہنّم کی آگ اوراس کی ہولناکیاں اورآخرت میں جنت کی عظمت بیان کرکےاس بات کی ترغیب دی ہے کہ آدمی دوزخ سے بچنے کی کوشش کرے اور جنت کے حصول کے لیے جدوجہد کرے۔ لہٰذا جھوٹی بات منہ سے نکلے گی یا وعدہ خلافی ہوگی تو جس طرح ہاتھ خود بخود آگ سے پیچھے کھنچ آتا ہےآدمی محسوس کرے کہ میں نے اپنی زبان پر گویا جلتا ہواانگارارکھ دیا ہے۔حرام مال اگر پیٹ میں جارہاہےتو یوں محسوس ہو کہ جیسے آگ پیٹ میں جارہی ہو۔قرآن نے خود کہا ہے کہ حرام کھانا اسی طرح ہے جیسے آگ پیٹ میں جارہی ہو۔لیکن یہ کیفیت کہ ہاں واقعی روپیہ پیسہ پیٹ میں نہیں ڈال رہا بلکہ آگ ڈال رہا ہوں،جس قدرراسخ ہوگی،اسی قدر دل میں تقویٰ کی کیفیت پیدا ہوگی۔تقویٰ کا اظہارلباس سے،کھانے پینے سے،چلنے پھرنے سےاور بہت ساری چیزوں سے بھی ہوتا ہے،لیکن بنیادی بات یہی ہے جواوپر بیان کی گئی ہے۔

اہلِ جنت کےاوصاف

اب یہاں ان صفات کا تذکرہ کیا جارہا ہے جواہلِ جنت کےاوصاف ہیں اورجن کے حصول کے لیےایک مومن کوتگ ودوکرنی چاہیے۔

الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ(اٰل عمرٰن ۳:۱۳۴)

جوہرحال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں،خواہ بدحال ہوں یا خوشحال۔

یہ پہلی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ ہرحال میں خرچ کرتے ہیں،خواہ بدحال ہوں یا خوشحال۔ بعض دفعہ کم ہوتا ہےاوربعض دفعہ زیادہ،بعض دفعہ تنگی ہوتی ہےاوربعض دفعہ کشادگی،کبھی حالات میں سختی ہوتی ہےاورکبھی نرمی،غرض جیسے بھی حالات ہوں ان میں وہ خرچ کرتے ہیں۔بعض جگہ کہا گیا ہے کہ مال خرچ کرتے ہیں،بعض جگہ یہ کہا گیا ہے کہ جو مال ہم نے ان کو دیااس میں سے

خرچ کرتے ہیں لیکن یہاں پر واضح نہیں کیا گیا کہ کیا خرچ کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ آدمی کو دُنیا اور مال سے محبت ہوتی ہے، لہٰذا یہاں پہلی بات دُنیا اور مال کا خرچ کرنا ہے۔

رزق کا لفظ قرآن مجید میں صرف مال کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ صلاحیتوں، استعداد، حیثیت، اخلاق اور بہت سی چیزوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اگر وسیع معنوں میں اس کا مفہُوم لیا جائے اور بات مال سے شروع ہو تو اہل ایمان سے مراد وہ لوگ ہیں جو مال بچا بچا کر اور سینت سینت کر یا روک کر رکھنے کی بجائے یا ہمیشہ حاصل کرنے کی بجائے جو کچھ ان کے پاس ہو اللہ کے بندوں پر لٹانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ گویا مال ہو یا استعداد، کوئی حیثیت اور صلاحیتیں اور مقام حاصل ہو یا کسی کے کام آیا جا سکتا ہو یا کسی کا کوئی بھلا کر سکتے ہوں، یہ ہر وقت اللہ کی مخلوق کو دینے کی فکر میں رہتے ہیں نہ کہ لینے کی فکر میں۔ جو کوئی یہاں پر دینے کی فکر میں ہو وہ اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ وہ آخرت کے روز سب کچھ اللہ سے لینے کی پوزیشن میں ہوگا، اور جو یہاں پر ہر وقت لینے کی فکر میں ہو اُس کو آخرت کے روز سب کچھ دینا پڑے گا۔ یہ آسان اور سادہ سی بات ہے کہ جو یہاں پر اپنی ہر خواہش پوری کرے گا وہاں پر اُس کی ہر خواہش مسترد ہو جائے گی، اگر اسے بھوک لگے گی تو کھانے کو کانٹے ملیں گے، اگر پیاس لگے گی تو پینے کو گرم پانی ملے گا، سونے کو دل چاہے گا تو آگ کا بستر ملے گا، اور جو یہاں اپنی خواہشات سے رُک جائیں گے تو انھیں وہاں پر ہر وہ چیز ملے گی جس کی وہ خواہش کریں گے بلکہ اس سے بھی زیادہ ملے گا۔

دراصل یہ مومن کی بنیادی مطلوبہ صفت ہے کہ وہ دُنیا میں رہے اور خرچ کرنے، دینے، سخاوت کے ساتھ فیاضی اور لٹانے کی کیفیت اس کے دل میں ہو۔

وَالْـكٰـظِـمِيْـنَ الْـغَيْـظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَ الـلّٰـهُ يُـحِـبُّ الْمُحْسِنِيْنَ o

(اٰل عمرٰن ۳:۱۳۴)

جو غصّے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ اور احسان کرنے والے لوگ تو اللہ کو بہت پسند ہیں۔

یہاں اگر چہ منفی بات کہی گئی ہے لیکن محبت اور اخوت جو باہمی تعلقات کو صحیح بنیادوں پر قائم رکھنے کے لیے مسلم ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ باہم ملنے جلنے سے جو شکایتیں، تلخیاں اور کدورتیں پیدا ہو جاتی ہیں، انھیں دل سے معاف کر دیا جائے۔ ہمارا اور آپ کا تجربہ ہے کہ آدمی کتنی ہی محبت کرتا ہو لیکن اولاد سے بھی ناراض ہو جاتا ہے، بیوی سے بھی تلخی ہو جاتی ہے، اور دوستوں سے بھی اَن بن ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہاں ہدایت کی جا رہی ہے کہ یہ بہت اعلیٰ صفت ہے کہ آدمی غصّے کو پی جائے، تلخی کو برداشت کر لے اور لوگوں کو معاف کر دے۔ یہ اجتماعی زندگی کے لیے بالکل بنیادی اور لازمی صفت ہے۔

یہ بھی مشاہدے کی بات ہے کہ جو آدمی خرچ نہیں کرتا وہ تنگ دل ہوتا ہے، اور جو دینے اور خرچ کے لیے تیار ہو اس کا دل فیاض اور ہاتھ کھلا ہوتا ہے۔ لہٰذا جس کا دل کھلا ہوگا وہ معاف کرنے میں بھی کھلے دل کا مظاہرہ کرے گا، اور جس کا دل تنگ ہوگا وہ مال کو بھی سینت سینت کر رکھے گا، اور اپنی صلاحیتوں کو بھی راہِ خدا میں نہیں لگائے گا اور معاف کرنے میں بھی تنگ دل ہوگا۔

معافی وہ صفت ہے جو تعلقات خواہ قائد کے ہوں یا کارکنوں کے، انسانوں کے باہمی تعلقات ہوں یا اسلامی جماعت کے، خاندان، گھر یا پھر پورے معاشرے کے ان میں شیرینی، حلاوت اور مٹھاس گھول دیتی ہے، اور جس آدمی کے اندر یہ صفت ہو وہ بڑا بردبار، بڑا کریم اور اونچی صفات کا حامل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ عمل بہت پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بھی یہ تعریف فرمائی ہے کہ وہ رحمت کرنے والے اور بہت معاف کرنے والے ہیں۔ انسانوں سے بھی کہا کہ معاف کرو، یہاں تک کہ اگر کوئی تم کو تکلیف بھی پہنچائے اور تم بدلہ لینے پر قادر بھی ہو، تب بھی معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ کو یہ عمل بڑا محبوب اور مرغوب ہے۔

جو آدمی اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی تلاش میں بھاگ دوڑ کر رہا ہو، اور روز سو غلطیاں کرتا ہو اور اُمید رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے گا، آخر وہ بندوں کے بارے میں سخت کیسے ہوگا؟

اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ ط (النور ۲۴:۲۲)

کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمھیں معاف کرے؟

جب واقعہ افک پیش آیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی گئی تو اس تہمت لگانے میں منافقین کے ساتھ بعض سچے مومن بھی شامل ہو گئے۔ ان میں ایک حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بھانجے بھی تھے جن کی وہ کچھ مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت کا اعلان ہو گیا تو انھوں نے کہا کہ آیندہ میں ان کی امداد نہیں کروں گا۔ ذرا سوچیے کہ وہ اس بات میں بالکل حق بجانب تھے۔ ان کی بیٹی کی عصمت اور عفت کا معاملہ تھا، اس پر تہمت لگائی گئی تھی، اور بظاہر دُنیا کے ہر قانون کی رو سے وہ حق بجانب تھے، لیکن قرآن نے کہا کہ یہ صدیقوں کا مرتبہ نہیں کہ وہ یہ روش اپنائیں:

اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ ط (النور ۲۴:۲۲)

کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمھیں معاف کرے؟

وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ص وَ مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ص قف وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَهُمْ یَعْلَمُوْنَo (اٰل عمرٰن ۳:۱۳۵)

اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو؟ اور وہ کبھی دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔

ابتدائی آیات میں یہ کہا گیا تھا کہ اپنے رب کی مغفرت اور بخشش کے لیے بھاگ دوڑ کرو۔ اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ جب کبھی اہل ایمان سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہو جائے یا وہ کسی غلطی کے مرتکب ہو جائیں تو وہ فوراً اپنے رب کو یاد کرتے ہیں اور اس کی طرف پلٹ آتے ہیں۔ اس میں غلطی اور لغزش ہو جانے پر بڑی تسلی کا سامان ہے کہ متقین کی یہ تعریف نہیں ہے کہ ان سے گناہ سرزد نہیں ہوتے۔ اگر کسی کے ذہن میں یہ تعریف ہو تو وہ اپنے گناہ سے شکست کھا جاتا ہے، مایوس ہو جاتا ہے اور تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ خیال رہے کہ اللہ کی راہ میں جدوجہد کے دوران کوئی اسٹیشن ایسا نہیں ہے کہ جہاں آدمی تھک ہار کر بیٹھ جائے۔ یہ تو آخری سانس تک جدوجہد کا سفر ہے۔ اس دوران لغزشیں ہوں گی، خطائیں ہوں گی، گناہ سرزد ہوں گے، آدمی بھول جائے گا، نسیان کا شکار ہوگا، ارادہ کمزور پڑ جائے گا اور کبھی عجلت پسندی بھی طاری ہوگی۔ یہ سب کچھ ہوگا لیکن مومن کبھی مایوس نہیں ہوتا۔

متقین کی یہ صفت نہیں ہے کہ وہ غلطی نہیں کرتے بلکہ صفت یہ ہے کہ وہ ہوشیار اور چوکنے رہتے ہیں کہ اگر کبھی غلطی ہو جائے یا کھلی بے حیائی کا ارتکاب کر بیٹھیں، یا اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھیں تو انھیں فوراً اللہ کی یاد آ جاتی ہے اور وہ اس کی طرف پلٹ آتے ہیں۔ وہ اپنے گناہ کی معافی مانگتے ہیں اور اس گناہ پر اڑ کر نہیں رہ جاتے ہیں۔ یہی دراصل انسان اور شیطان کے درمیان فرق ہے۔ فرشتے وہ ہیں جن سے گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا، جب کہ شیطان اور آدم کا یہ فرق ہے کہ آدم علیہ السلام سے جب بھول ہوئی تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے رجوع کر لیا اور استغفار کیا:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا سکتہ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝
(الاعراف ۷:۲۳)

اے ہمارے رب، ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف توجہ فرمائی اور انھیں معاف کر دیا۔ شیطان اپنی بات پر اڑ گیا کہ میں نے بالکل درست کیا ہے، اور وہ ہمیشہ کے لیے مردود ہو گیا۔

اپنے گناہوں پر اصرار، ان پر اڑنا، ان کا بار بار ارتکاب کرنا، ان کی تلافی نہ کرنا، یہ وہ چیز ہے جو تقویٰ کے خلاف ہے۔ محض گناہ کا سرزد ہو جانا، تقویٰ کے خلاف نہیں ہے۔ حدیث میں ایک اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اس کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جب آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ داغ پڑ جاتا ہے۔ جب وہ استغفار کرتا ہے تو وہ داغ صاف ہو جاتا ہے۔ اگر وہ استغفار نہیں کرتا اور مزید گناہ کرتا ہے تو داغ اور بڑھ جاتا ہے۔ وہ اس طرح جب تک گناہ کرتا رہتا ہے، سیاہ داغ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: کَلَّا بَلْ ٜ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ جو وہ کماتے تھے اس کی وجہ سے ان کے دل پہ زنگ جم گیا۔ لہٰذا مومن کی یہ بنیادی صفت ہے کہ وہ اللہ کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے، اور اگر کبھی بھول ہو جائے تو فوراً اپنے رب کی طرف لوٹ آتا ہے۔

قرآن نے جہاں جنت کی بشارت دی ہے، وہاں اہل ایمان کی سب سے پہلی صفت یہ بیان کی ہے:

> **هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ۝** (قٓ ۵۰:۳۲)
>
> یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر اس شخص کے لیے جو بہت رجوع کرنے والا اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا۔

اوّاب کے معنی ہوتے ہیں بار بار لوٹ آنے والا، بڑی کثرت سے لوٹنے والا۔ اوابین ان کو کہا گیا ہے، جو اللہ کی طرف بار بار لوٹنے والے ہیں۔ دراصل اللہ تعالیٰ سے غافل اور بے نیاز ہو کر خودسر بن جانا مطلوب نہیں ہے۔ آدمی کو نیکی کا غرور اور زعم نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ فکر دامن گیر ہونی چاہیے کہ جب غلطی ہو، تو آدمی اللہ کی طرف لوٹے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان بھی ہے

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کثرت سے استغفار کرتے تھے، کہیں ستر مرتبہ کا لفظ آیا ہے اور کہیں سو۔ بہت سی احادیث میں اس کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وہ نبی جن کی ساری خطائیں معاف تھیں، جو معصوم عن الخطا تھے، وہ بھی بار بار استغفار کرتے تھے تو ہم جیسے گناہ گار اس بات کے کس قدر محتاج ہیں کہ استغفار کریں۔ اس پر نظر رکھیں کہ جو منزل ہم نے اپنے لیے طے کی ہے، جو مقاصد ہمارے پیش نظر ہیں اور جو راستہ اپنے لیے منتخب کیا ہے اُس پر چلنے میں جو کوتاہیاں اور لغزشیں ہوں، ان پر پلٹ پلٹ کر معافی مانگیں، اپنے سفر کا دوبارہ آغاز کریں اور اللہ سے اُمید رکھیں کہ وہ دوبارہ ہاتھ پکڑے گا، اس راہ پر چلائے گا اور منزل تک پہنچائے گا۔

اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِھَا الۡاَنۡھٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡھَاؕ وَ نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَo (اٰل عمرٰن ۳:۱۳۶)

ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ اُن کو معاف کر دے گا اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک اعمال کرنے والوں کے لیے۔

وہ لوگ جن میں یہ صفات ہوں گی اور جو اللہ کی راہ میں بھاگ دوڑ کریں گے، ان سے اللہ نے یہیں پر یہ وعدہ فرما دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے گا، انھیں بہترین جزا سے نوازے گا اور جنت میں داخل کرے گا جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کے لیے یہ بہت اچھا بدلہ اور بہترین جزا ہے۔

زندگی تو چند لمحات کی نعمت ہے۔ ہم جتنے بھی لمحات شمار کریں فی الواقع یہ چند لمحات ہی ہیں۔ جب آخری لمحہ آئے گا تو ہم کہیں گے کہ یہاں چند دن ہی رہے تھے۔ جس کی جتنی بھی عمر ہوگی خواہ وہ ستر برس کا ہو یا پندرہ بیس برس کا، جب وہ پلٹ کر دیکھے گا تو معلوم ہوگا کہ پلک جھپکنے میں ہی یہ عمر گزر گئی۔ اگر ہم نے محنت کر لی تو پھر اس کے نتیجے میں وہ زندگی ہے جو ہمیشہ رہنے والی ہے۔

اس میں وہ انعامات ہیں جن کا وعدہ ہم سے کیا گیا ہے۔ یہی مطلوب ومقصود ہونا چاہیے۔ جب یہ مطلوب ومقصود بن جائیں گے، تو پھر ہم اللہ کی راہ میں جہاد، اس کی راہ میں کوشش، اور اقامت دین کے لیے جدوجہد صحیح معیار اور پیمانے سے کرسکیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے جو بھاگ دوڑ ضروری قرار دی ہے، اس کی تعبیر جہاد ہے۔ جہاد کے لیے اس سورۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے صاف وعدہ کیا ہے، کہ جو لوگ میری راہ میں گھروں سے نکالے جائیں، جنھیں اذیتیں دی جائیں اور وہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور مارے جائیں، ان کو لازماً میں جنت میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

یہ وہ راستہ اور منزل ہے جو مقصود و مطلوب ہے۔ اس کے لیے آج جو کچھ کرنا ہے وہ بھی واضح کر دیا گیا ہے اور کل جو کچھ ملنے والا ہے وہ بھی یقینی ہے۔ اب یہ ہماری کوتاہی اور بدقسمتی ہوگی کہ ہم بیٹھے رہ جائیں اور اس کو نہ حاصل کر پائیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ آج دن بھر محنت کرلو، کل تمھارے لیے ایک عالی شان محل تیار ہوگا، تمھارا بنک بیلنس ہوگا اور تمھارے لیے دُنیا کی ساری نعمتیں مہیا ہوں گی تو ہم دن بھر اس کی فکر کریں گے۔ اس لیے کہ ہمیں اس وعدے پر پختہ یقین ہوگا۔ ہم دن بھر اس کے لیے کام کریں گے اور محنت کریں گے، اس کی فکر میں رہیں گے، کہ اس کے بعد جب ہم گھر کو لوٹیں گے تو ہمارے لیے یہ سب کچھ یقینی ہوگا۔ یہ سفر آج یا کل کسی بھی وقت پیش آ سکتا ہے۔ اگر ہم تیاری شروع کر دیں اور ممکن ہے کہ ہماری یہ تیاری چند ماہ یا چند سال کی ہو، اس سے زیادہ نہ ہو لیکن تیاری اور محنت کرنا ضروری ہے۔ ہم اسی کے مکلّف ہیں اور اسی کے لیے جواب دہ ہیں۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے وعدے موجود ہیں۔

میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

❖❖❖